کتاب پر تبصرہ

کتاب کا نام : ہند یاترا
مصنف : ممتاز مفتی
ناشر : اِظہار سنز
سال اشاعت : ۱۹۸۲ء
صفحات : ۳۵۹
قیمت : پچاس روپے
تبصرہ نگار : ڈاکٹر فرح گل بقائی*

یہ کتاب کل سترہ ابواب پر مشتمل ہے۔ کہانی شروع ہوتی ہے مصنف کے گاؤں بٹالے کے ذکر سے جہاں ممتاز مفتی نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال گزارے۔ انسان کو اپنی جائے پیدائش اور جہاں اس نے بچپن گزارا ہو اس سے فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ یہی حال جناب مفتی صاحب کا تھا۔

جناب مفتی صاحب ہندوستان کی سیر کرنے کیوں جانا چاہتے تھے۔ اس کے کئی عوامل تھے ایک تو امیر خسرو کے مزار پر حاضری جو کہ دہلی میں واقع ہے دوسرے ہومیو پیتھی کی کتابوں تک دسترس حاصل کرنی تھی۔ یورپ کے بعد ہومیو پیتھی کا گڑھ دہلی ہے۔

ممتاز مفتی اس کتاب میں مختلف انواع و اقسام کے موضوع زیر بحث لائے ہیں۔ کتاب کی افادیت تبھی بنتی ہے جب وہ آپ کے ذہن کو جھنجھوڑے آپ کو سوچنے سمجھنے اور حقائق کو جانچنے کی طرف راغب کرے۔

---

* سینئر ریسرچ فیلو، قومی ادارہ برائے تحقیقِ تاریخ و ثقافت، قائد اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد۔

مصنف نے سوال اُٹھاتے ہیں کہ پاکستان کن وجوہات کی بنا پر وجود میں آیا۔ ہر لکھنے والے نے اپنے اپنے علم کے سمندر سے اس کی توجیحات اور محرکات بیان کی ہیں ممتاز مفتی کا اپنا دلچسپ انداز ہے وہ لکھتے ہیں کہ ہندو کی خاصیت ہے کہ وہ سب کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ ہندو کی اس اپنائیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسرے دھرم کو یوں اپنا لیتا ہے کہ اس کی انفرادیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن خود ہندو پر آنچ نہیں آتی۔ وہ اس لیے اپناتا ہے کہ خود کو تقویت دے اور دوسروں کو معدوم کر کے رکھ دے۔

مصنف پاکستان بننے کے محرکات اور تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کچھ لوگ کہتے ہیں اسلام تلوار کے زور پر پھیلا سچ کہتے ہیں۔ لیکن وہ تلوار لوہے کی تلوار نہیں تھی کردار کی تلوار تھی۔ خدمت کی تلوار تھی۔ یہ سامنے جو داتا بیٹھا ہے کیونکہ داتا دربار سے دہلی کے سفر کا آغاز تھا۔ یہی وہ تلوار ہے جس نے شمالی ہند میں اسلام پھیلایا۔ ایک ایسی ہی تلوار اجمیر شریف میں پڑی ہے۔ ایک پاک پتن، ایک قطب مینار کے پاس دلّی میں ہے ایسی کئی ایک تلواریں ہیں انہیں زنگ نہیں لگا یہ آج بھی کاٹ رہی ہیں صرف غیر مسلموں کو ہی نہیں مسلمانوں کو بھی مسلمان بنا رہی ہیں ان تلواروں نے ہند میں آ کر غدر مچا دیا۔ اِندر پرست کو دلی بنا دیا۔ اجودھن کو پاک پتن بنا دیا۔ لاہور کو داتا کی نگری میں بدل دیا۔

کیونکہ مصنف ہومیو پیتھی کی کتب میں دلچسپی رکھتے تھے اور ان کے ساتھی اشفاق حسین احتیاط اور پرہیز پر مائل تھے اس لحاظ سے قارئین کو سفر میں احتیاط اور دھیان سے کھانے پینے کے اسباق بھی ہیں۔ پھر کچھ بیماریوں کا علاج بھی مثلاً شوگر کی بیماری سے نجات کے لیے وہ بیجی سار (انٹرنیٹ میں اس کو وجے یار) گلاس جس میں پانی رکھنے کے بعد پینے سے شفاء کی توقع کی جا سکتی ہے۔ بیجی سار ایک لکڑی کی قسم ہے اور یہ گلاس اس لکڑی کے بنے ہوئے ہیں جس میں شفا کے عنصر پائے جاتے ہیں۔ یہ دلی میں خرادیے کی دکان ہے بلّی ماراں میں، ہندوستانی دواخانے کی دکان کے پاس یوں مصنف ہلکے پھلکے انداز میں شوگر جیسی مہلک بیماری کا علاج بھی بتا گئے۔

ممتاز مفتی بڑے پیارے انداز سے قارئین کو ایک بہت اہم سبق بھی دیتے ہیں کہ انسان کوشش ضرور کرے مگر اپنے رب کو اپنے ساتھ شامل حال رکھے۔ اس سے مسلسل

رجوع میں رہے۔ جو مسئلہ جو کام اس سے حل نہیں ہو رہا وہ اللہ کے در پر چھوڑ دے کہ اب تو ہی میری مدد کر اگر نہیں ہوتا تو اب میں کیا کروں۔ میں ناقص، بے بس انسان جب انسان میں بندگی کا احساس جاگتا ہے۔اپنے کمتر ہونے کی جانکاری جنم لیتی ہے تو رب بندے کو سنبھال لیتا ہے اور اس کو وہ مل جاتا ہے جس کی وہ تلاش میں یا جستجو میں مگن ہوتا ہے۔

بندے اور اللہ کا کنکشن ممتاز مفتی کی کتابوں کا خاص موضوع رہے ہیں اور کوئی کتاب بنانے والے کے ذکر سے خالی ہو وہ کتاب پھر کتاب کہاں کباڑ ہے۔ انسان سرگرداں رہے۔ کچھ جاننے اور سمجھنے کی آرزو رکھے اور رب کے ذکر سے خالی ہو وہ کہاں اپنی منزل پا سکتا ہے۔

اس کتاب میں بقول مصنف اپنی طرف سے کوئی مرچ مصالحے نہیں ڈالے جو مصنف پر بیتا جو اس نے محسوس کیا اسے مَن وعَن قرطاس ابیض پر منتقل کر دیا۔

ممتاز مفتی ان اشخاص میں سے تھے جنہوں نے ۱۹۴۷ء کا پُر آشوب دُور دیکھا تھا قتل عام اور بھلی مانس قوم کو درندہ بنا ہوا دیکھا تھا۔ یہ پُر امن ہند نے اپنی جون ہی یک دم بدل ڈالی اور ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان کے خون کی دیوار کھڑی کر دی۔

ممتاز مفتی اس درد اور تکلیف کو اکتیس سال گزر جانے کے باوجود بھولے نہیں تھے پھر بھی انہوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ ہندوستان جائیں گے اور اس کی ایک وجہ جیسے بیان ہو چکی ہے ہومیو پیتھی کی کتب تھیں۔

ہومیو پیتھی سے متاثر ہونے کی وجہ ممتاز مفتی کی بیگم جو بیمار تھیں اور ان کے صحت یاب ہونے کے آثار کم ہی تھے۔ ہومیو پیتھی سے رو بصحت ہونا تھا۔ پھر ۱۹۴۰ء کے بعد سے مفتی صاحب ہومیو پیتھی کے علم میں دلچسپی لینے لگے۔ اور چالیس سال بعد بھی یہ ہومیو پیتھی سے لگاؤ کا سفر جاری اور ساری رہا۔ مفتی لکھتے ہیں ''یوں آپ ہی آپ پروگرام ہندوستان جانے کا بن گیا اور میں بھول گیا کہ سرحد کی سر زمین میں مسلمانوں کے خون سے ابھی تک رنگین ہے اور مشرقی پنجاب کے لاکھوں شہید حیرت سے میری طرف دیکھ کر

پوچھ رہے ہیں کہاں جا رہے ہو؟ یہ تم کیا کر رہے ہو؟

مفتی صاحب لکھتے ہیں ''صاحبو میں ہندو کے غصے سے نہیں ڈرتا حالانکہ میں نے تقسیم کے وقت اس کا راکشی روپ دیکھا ہے میں ہندو کے پیار سے ڈرتا ہوں۔ ہند جانے سے گریز کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں ڈرتا ہوں اپنے سر آنکھوں پر بٹھائے جانے سے۔ ہندو جس اپنایت اور محبت سے پیش آتا ہے۔

مصنف تحریر کرتے ہیں میں ایک کمزور آدمی ہوں مجھ میں اخلاقی مضبوطی نہیں ہے اگر کوئی دونوں ہاتھ جوڑ کر کمالِ عجز سے کہے، مہا راج ہم تو ایک ہیں اور بارڈر کی یہ لکیر جو ہمیں جدا کرتی ہے جھوٹی ہے۔ میں اسے یہ نہیں کہہ سکتا کہ نہیں مہاراج میں آپ میں سے نہیں ہوں۔ ہمارے راستے الگ ہیں ہمارے رہن سہن الگ ہیں۔

امیر خسرو کے مزار پر جانے والے زائرین داتا دربار کے مزار پر ان بسوں کا انتظار کر رہے تھے جنہوں نے انہیں دہلی لے جانا تھا۔ ممتاز مفتی اس انتظار کی کیفیت میں لکھتے ہیں کہ ''یہ داتا لوگ خوب لوگ ہیں صرف دو کام جانتے ہیں دینا اور مسکرانا۔ دیتے اور مسکراتے ہیں۔ دیئے جاتے ہیں اور مسکرائے جاتے ہیں۔ یہ نہ دیکھو کہ مانگنے والا کون ہے کیسا ہے۔ ہندو ہے۔ بدھ ہے۔ عیسائی ہے۔ مسلمان ہے۔ نیک ہے یا بد، اچھا برا دینے والا دینا جانتا ہے پرکھنا نہیں جانتا۔

داتا کے پاس ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ یہ ماحول کی پراگندگی سے آزردہ نہیں ہوتے جو چاہنے والوں کی حرص و طمع پر ناراض نہیں ہوتے جو دینے اور مسکرانے کے کچھ نہیں کرتے۔

صفحہ ۵۷ سے امرتسر کی کہانی اور ۱۹۴۷ء کے امرتسر کا ذکر ہوتا ہے۔ کہانی نویس تو اپنی بات اور یادیں ضبط قلم کرتا ہے لیکن پڑھنے والوں کے دل اور دماغ جو وہاں رہے ہوں یا جنہوں نے وہ کہانیاں بنتی دیکھی ہوں ایک وقت پر آ کر ٹھہر جاتے ہیں ٹھٹھر جاتے ہیں یہ سب بھی ہونا تھا اور اس شدت سے ہونا تھا۔

امرتسر کے ذکر کے بعد مصنف اپنی ٹین ایج محبت کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ کوئی بھی

کہانی بغیر محبت کے ذکر ادھوری ہی رہتی ہے۔

صفحہ ۳۱۲ پر مفتی صاحب یوں قلم مو

بولو مہاراج: چند ایک غیر ملکی سیاح بڑے غور سے لاٹ (قطب مینار) کو دیکھ رہے تھے۔ اِس پُر شوکت محراب کو دیکھ رہے تھے۔ جو لاٹ کے متصل کھڑی ہے۔ بھارت کے ٹورازم کے کارکن ان سیاحوں کو لاٹ کی عظمت کے نکات سمجھا رہے تھے۔

مصنف نے دل میں سوچا کہ ٹورازم کے کارکنوں سے پوچھے کہ یہ ''اپنی دلی جا کر سیاحوں کو دیکھائیں'' یہ بیگانی چیزیں دیکھانے کا فائدہ۔

جن مسلمانوں نے آپ کے دیش کو اتنی عظیم تعمیرات بخشی تھیں جنہوں نے اس ملک کو سجایا تھا ان مسلمانوں کو آپ نے کیا دیا۔ انہوں نے پناہ گاہ کے طور پر ایک خطہ زمین مانگا تھا۔ آپ نے غصہ میں آ کر خون کی ندیاں بہا دیں۔ لاشوں کے پشتے لگا دیئے۔ آج چونتیس سال ہو چکے ہیں آپ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ سیکولر انڈیا میں فسادات کا تانتا نہیں ٹوٹا۔

کچھ گُر کی باتیں: کتاب کا مزا جبھی آتا ہے کہ جب لکھاری اپنے پلہ سے قارئین کے پلے میں کوئی گُر کی بات ڈال دے مفتی صاحب کے دوست اشفاق حسین اپنے ستار کے لیے تاریں ڈھونڈ رہے۔ ہر ممکنہ جگہ پر تلاش کر چکے تھے مگر ان کی کوششیں بے سود تھیں۔ ممتاز مفتی ان سے مکالمہ کرتے ہیں اور کہتے کہ تم سو فیصد تدبیریئے ہو۔ تدبیریئے ہر بات اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ بھائی میرے کچھ باتیں اللہ کے ذمہ ڈالنا بھی سیکھو۔

مفتی لکھتے ہیں ''میرا ایک بزرگ دوست ہے وہ تین مرتبہ تدبیر کرتا ہے۔ تن من دھن سے کوشش کرتا ہے۔ پھر بھی کام نہ ہو تو وہ اس کام کو اللہ کے در پر رکھ دیتا ہے۔ کہتا ہے مجھ سے تو یہ کام نہیں ہوا۔ اب میں اسے تیرے در پر رکھ رہا ہوں۔ چاہے تو کر دے نہیں تو نہ سہی تیری مرضی۔ تو مالک ہے۔

انسان کا فرض کوشش کرنا ہے دینا نہ دینا یہ رب کائنات کی مرضی ہے۔

دلی واسے پیچھے سے پنجابی

چار دن ہو گئے تھے ممتاز مفتی اور اشفاق حسین کو دلی میں گھومتے پھرتے جس سے ملتے اور بات نکلتی کہ آپ کہاں سے آئے ہیں تو پتہ لگتا کوئی لاہور بتاتا کوئی پنڈی، کوئی سیالکوٹ، تو کوئی سرگودھا۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم دلی کے ہی ہیں۔ مگر یہ دلی والے کہاں گئے۔ بقول ایک لالہ جی کے ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے ہر نئی قوم شمال سے آئی اور جو یہاں آباد تھے انہیں نیچے دھکیل دیا۔ کوئی آئے اور دراوڑوں کو دھکیل دیا آریہ آئے تو انہوں نے کولوں کو دھکیل دیا۔

ایک جگہ مفتی صاحب لکھتے ہیں:

جنتی مخلوق: مرد سے زیادہ معصوم اور جنتلی مخلوق میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ مرد دن بھر کام کرتا ہے تا کہ گھر کے افراد کا پیٹ پال سکے بیوی کی فرمائش پوری کر سکے بیٹی کو اس کی ماں کے چاؤ کے مطابق جہیز دے سکے بیٹا کا بیاہ ٹھاٹھ سے کر سکے۔ تا کہ بیٹے کی ماں کی ناک نہ کٹے اور یہ سب کام وہ صرف ایک بات کے عوض خوشی خوشی کرتا ہے اس کا مطالبہ ہے کہ مجھے گھر کا بڑا سمجھو۔ بڑا سمجھنے کے بعد چاہے مجھے اپنی خدمت پر لگائے رکھو۔

بُدھ مت: مصنف نے اپنی کتاب ہند یاترا کا مقالہ یہ رکھا ہے کہ ہندو چاہے اپنے اوپر کتنے ہی وقت کے لحاظ سے لبادے چڑھا لے مگر بیچ میں سے وہ ہندو ہی ہے۔ جیسے کھجور انواع و اقسام کی ہوتی ہیں مگر ان کی گٹھلی کھجور کے پھل ہی کی ہوتی ہے۔

مصنف لکھتا ہے کہ ہندو صدیاں۔ بدھ مت کے تحت جیا۔ وہ بدھ جس نے سارے ایشیا کو بدل ڈالا۔ وہ بدھ ہندو کا بال بیکا نہ کر سکا الٹا ہندو نے اس کے ماتھے پر اپنا ٹیکہ سجا دیا۔ اسے اپنے رنگ میں رنگ دیا اور پھر ہندویت میں جذب کر لیا۔ آج بھی وہ ایشیا کے کئی ایک ممالک میں موجود ہے لیکن ہند میں اس کا پتہ نہیں ملتا۔

پھر مسلمان آئے۔ سینکڑوں سال ہندو مسلمانوں کے تحت رہا۔ مسلمان بادشاہوں کا وزیر بنا۔ بڑے بڑے منصب حاصل کیے۔ مسلمانوں کے طور طریق میں رہن سہن کیا۔ لیکن

اپنی جداگانہ حیثیت قائم رکھی بلکہ مسلمان درباروں پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔

پھر انگریز آیا صدیوں ہندو انگریز کے تحت رہا۔ انگریز کا رنگ اپنایا لیکن باہر باہر سے۔ اس کے رنگ میں ڈوبا نہیں۔ اپنی روایات کو سینہ سے لگائے رکھا۔ اور آج آزادی پا لینے کے بعد۔ صدیوں کے بعد اپنا راج قائم کر لینے کے بعد۔ کیا ہندو بدل گیا ہے؟ اس نے صبح سویرے جاگنا چھوڑ دیا۔ ٹہلنا چھوڑ دیا۔ کیا اسے دکان کا جنون نہیں رہا۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر یہ ساری دوکانیں بند کیوں ہیں۔

مصنف یہ بات واضح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اب ہندوؤں میں بھی وہ پرانی واضح قطع باقی نہیں رہی۔

ممتاز مفتی اپنے بہاؤ میں بات سے بات نکالتے جاتے ہیں اور قارئین اس میں سے اپنے من کا سودا چُنتا جاتا ہے۔ یہی سود مند سودا ہے۔